انیسویں صدی کے ایک گمنام ناول ''نشتر'' کے مرکزی کرداروں کا اجمالی تجزیہ

عارف کلیم

سفیر حیدر

Abstract:

Sajjad Husain Anjum Kasmandvi appeared in the last decade of the 19th century with his important but neglected or very less disenssed novel "Nishter". According to the author "Nishter" is the urdu translation of Syed Hassan Shah's biographic persion novel "Nishter" which he wrote in 1793. But the persion version of Nishter never founded. In this artical a brief analysis of main characters Hassan Shah and Khanum Jan in presented.

منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ کے ہم عصر اور ہم نام سجاد حسین انجم کسمنڈوی کا ناول ''نشتر'' ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا۔ مصنف کے بقول یہ ناول سید حسن شاہ نامی شخص کے سوانحی قصے کا سادہ اُردو ترجمہ ہے جو اس نے ۱۷۹۳ء کے لگ بھگ فارسی میں تحریر کیا تھا۔ تاہم سید حسن شاہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا فارسی نسخہ کبھی منظر عام پر نہیں آیا۔ علاوہ ازیں اور مختلف وجوہ کی بنیاد پر عزیز احمد، مبارز الدین رفعت، اختر انصاری اور ڈاکٹر یوسف سرمست اسے ترجمہ نہیں سجاد حسین انجم کا طبع زاد ناول مانتے ہیں۔[۱]

بنیادی طور پر یہ ناول سید حسن شاہ اور خانم جان کی داستان عشق پر مبنی ہے۔ سید حسن شاہ ایک انگریز فوجی افسر مسٹر منگ کا منشی ہے اور اس کے جملہ مالی حساب کتاب کا ذمہ دار ہے، جبکہ خانم جان نوعمر، نوخیز، خوش جمال اور خوش گلو گائیکہ ہے جو مسٹر منگ کے ملازم ایک کشمیری طائفے کی رکن ہے۔

اعظم جی نامی ایک تاجر کا کاروبار میں دیوالیہ نکلا تو ایک رنڈی چنبل جان کے ساتھ طائفہ بنا کر گزر بسر کی راہ اختیار کی۔ اس طائفے میں گلبدن، بی جان اور خانم جان شامل ہیں۔ خانم جان نائیکہ چنبل جان کی نواسی ہے۔ مسٹر منگ کے ہاں نشاطیہ محفلوں میں نوجوان حسن شاہ اور خانم جان کے درمیان ملاقات دوطرفہ عشق میں ڈھل جاتی ہے۔ دونوں چوری چھپے اور خط و کتابت کے ذریعے اس سفر میں آگے بڑھتے رہتے ہیں اور چونکہ خانم جان طائفے کی

رکن ہونے کے باوجود پاکباز رہنا چاہتی ہے لہٰذا دونوں چوری چھپے نکاح کر لیتے ہیں۔ اسی طرح چوری چھپے وصل سے بہرہ مند ہوتے رہتے ہیں کہ مسٹر منگ کا تبادلہ ہو جانے پر طائفے کو چنار گڑھ جانا پڑا۔ حسن شاہ نے وعدہ کیا کہ تین چار دن کے بعد وہ چنار گڑھ پہنچ کر خانم جان کو بھگا لے آئے گا لیکن ضروری سرکاری امور کی وجہ سے اسے زیادہ دن لگ گئے۔ جب وہ ان کے پیچھے گیا تو اس طائفے کا کوئی سراغ نہ ملا اور اسے مجبوراً واپس دہلی آنا پڑا۔ چند دن بعد اسے خانم جان کی بیماری کا خط ملا اور وہ لکھنو پہنچا تو اس کی جدائی کی تاب نہ لاتے ہوئے خانم جان انتقال کر چکی تھی۔ ناول کا پلاٹ صراط مستقیم میں آغاز سے انجام تک پہنچتا ہے۔

سید حسن شاہ اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ خوش جمال اور خوش ذوق نوجوان ہے۔ اس کے سینے میں جذبات سے سرشار لبریز دل دھڑکتا ہے۔ حُسن حسن پرست ہے۔ ایک تو وہ سیّد ہے اور دوسرا شعر و شاعری میں مہارت کا حامل ہے۔ لہٰذا اس طائفے کے لیے اہمیت کا حامل ٹھہرا۔ گاہ حسن شاہ ان کی غزلوں کی نوک پلک سنوارتا گاہ کوئی مذہبی رسم اس کی موجودگی سے پایہ تکمیل کو پہنچتی۔ خانم جان کا حُسن سید حسن شاہ کے صبر و قرار کو لوٹنے کا سبب بن گیا۔ آغاز شباب کا عشق کسی طوفان بلا خیز کی طرح اس کی ذات کو بہالے گیا۔ خانم جان سے پہلی ملاقات میں حسن و عشق کی وارفتگی و بے خودی کی تصویر کشی ملاحظہ کریں:

> جو عورت اُٹھ گئی تھی، اپنے ہم راہ ایک نازنین، آفت جان دوشیزہ سیزدہ سالہ کو لے آئی جس کا چمپئی رنگ اور چشم شہلا قیامت ڈھاتی تھی۔ کافر ادائی نے ہزار ہا ایمانوں پر مصیبت ڈالی تھی۔ نہایت زرق برق لباس اور زیوبیش بہا پہنے دوشالہ اوڑھے اس دل فریب ادا سے آگے کھڑی ہوگئی کہ بجلیاں گر پڑیں۔۔۔ میں بالکل مثل تصویر حیران اور بے حس و حرکت ہو گیا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ خون نے رگوں میں ایک غیر معمولی جوش مارا اور دل پھڑ پھڑا کے سینے کے اندر رہ گیا، سر چکرایا، بدن تھرایا۔''[۲]

سید حسن شاہ خانم جان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بہانے بہانے سے ان کے ہاں آنے جانے لگا۔ چنبل جان اور اس کا پورا طائفہ حسن شاہ کے سید ہونے کی بنا پر بہت تکریم کرتا ہے۔ نیاز پکنے کے موقع پر حسن شاہ سے فاتحہ خوانی کی درخواست کرتے ہوئے طائفے کے رکن محمد اعظم نے کہا:

> جناب پیرزادہ اور سید ہیں، شریک فاتحہ ہوں، موجب کمال خیر و برکت ہوگا اور ہم لوگ بے انتہا ممنون منت ہوں گے۔''[۳]

حسن شاہ ایک روایتی عاشق کی طرح مضطرب اور بے قرار روح کا مالک ہے۔ اب اس کا قرار خانم جان کے دیدار و کلام سے وابستہ ہے لہٰذا وہ اپنی عذتِ سادات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کسی نہ کسی بہانے خانم جان کے آس پاس منڈلاتا رہتا ہے۔ اس کی حتی الامکان کوشش یہی ہے کہ خانم جان کے علاوہ کسی کو اس معاملے کی بھنک بھی

نہ پڑے۔ حسن شاہ کو اپنے جذبات پر اختیار نہیں۔ اس کی باطنی کیفیات جہاں اس کے چہرے سے عیاں ہو جاتی ہیں وہیں وہ دل پر لگنے والی ہر چوٹ پر بے اختیار رونے لگتا ہے۔ اس کا خلوص عشق، آہ وزاری، عشق میں بے بسی و مجبوری اور ترے کوچے اس بہانے مجھے دن سے رات کرنے والی کیفیت اسے اُردو غزل کے روایتی قالب میں ڈھالتی دکھائی دیتی ہے۔ وہ سید ہونے کے باوجود ایک مغنیہ پر عاشق ہے اور پھر ہر قسم کے نتیجے سے بے پروا اسے حاصل کرنے کے لیے پر عزم ہے۔ چونکہ خانم جان نہ صرف حسن شاہ کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت کی چمک دیکھ چکی ہے بلکہ وہ بھی حسن شاہ کے عشق میں گرفتار ہے لہٰذا محفل میں وہ جان بوجھ کر ایسی غزلیں گاتی ہے جو حسن کی آتش عشق کو اور بڑھا دیں۔ خانم جان کے گانے پر حسن کا ردعمل ملاحظہ کریں:

''اس کے بعد گانا شروع ہوا۔ چونکہ میں دو تین دن سے ضبط کر رہا تھا، دل بھر آیا اور کلیجہ امنڈنے لگا۔ بے اختیار مری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور ہچکیاں بندھ گئیں۔''[۴]

عالم گیر سچائی تو یہی ہے کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے لہٰذا حسن شاہ کی اس جذباتی کیفیت نے سب لوگوں پر اس کے باطن کو عیاں کر دیا۔ اس کا ماہی بے آب کی طرح تڑپنا اور بے اختیار رونے کا سبب طائفے کی جہاں دیدہ اور تجربہ کار رنڈیوں سے بھلا کیسے چھپا رہ سکتا تھا۔ چنانچہ میرزائی کہنے لگی:

''معلوم ہوتا ہے میر صاحب کو کسی سے تعلق بھی ہے۔ جب ہی تو یہ گداز، یہ سوز و ساز طبیعت میں ہے۔ گلبدن نے کہا، واقعی مجھے بھی ایسا ہی شبہ ہوتا ہے۔ بے شک کسی پری پیکر سے آنکھ لڑ گئی ہے۔''[۵]

حسن شاہ میں بے باکی اور جرات رندانہ کے برعکس حزم و احتیاط اور دور اندیشی کا رویہ دکھائی دیتا ہے۔ اسے اپنی اور خانم جان کی سماجی و معاشرتی حیثیت کا پتہ ہے لہٰذا وہ عزت سادات کو اپنی عاشقی کے گھاٹ اتارنے سے پرہیز کرتا ہے۔ وہ اپنے عشق میں صادق ہے اور کچھ ایسا راستہ تلاش کرنا چاہتا ہے کہ اسے اپنی منزل بھی مل جائے اور اس کے خاندانی وقار پر حرف بھی نہ آئے۔ لہٰذا وہ پھونک پھونک کر قدم اُٹھاتا ہے۔ اس راہ عشق میں جو سب پہ گزرتی رہی ہے حسن شاہ بھی اس سے دوچار ہوا۔ چنانچہ بے قراری، اضطراب، تڑپنا، امید و بیم، بے بسی و لاچاری، غرض یہ کہ حسن شاہ ایک روایتی عاشق کی طرح ہر آزمائش سے گزر جاتا ہے۔ آغاز محبت میں خانم جان اس کے خلوص عشق کی جان کاری کے لیے سرِ بزم اسے نظر انداز کرتی ہے اور حسن شاہ کے انگاروں پر لوٹنے کا سامان کرتی ہے۔ تاہم ناز و ادا سے حسن کی امیدوں کے چراغ روشن بھی رکھتی ہے۔ لہٰذا لاگ اور لگاؤ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

''حیران تھا کہ خدایا! یہ کیا اس کی سوجھی ہے کہ صاحب کے سامنے ذلیل کرنا چاہتی ہے۔ حالانکہ آج کسی قدر تسکین بھی کر دی تھی۔ پھر یہ عیاریاں اور شرارتیں کس لیے ہیں۔''[۶]

چونکہ دونوں کی ملاقات منگ صاحب اور دیگر افراد کے درمیان ہوا کرتی ہے لہٰذا اگر منگ صاحب یا کوئی

اور فرد دونوں کی کوئی چوری پکڑ بھی لیتا تو دونوں بڑی دانش مندی اور حاضر دماغی و حاضر جوابی سے بہ انداز احسن معاملات کو سنبھال لیتے ہیں۔ حسن شاہ کا کردار زندہ اور جیتا جاگتا گوشت پوست کے انسان کا کردار ہے۔ اس میں فوق البشر یا مبالغے کی کوئی کیفیت نظر نہیں آتی۔ وہ عیاش طبع نہیں۔ مطلب پرستی اور بوالہوسی کے عیب سے مبرا ہے۔ وہ کسی ایک گل کا بلبل ہو کر زندگی بیتانے کا قائل ہے۔ اس میں صالح مرد اور عاشق کی جملہ صفات موجود ہیں۔ ارتقاء پذیری کی جھلکیاں اس کے کردار کو جاندار کردار میں ڈھالتی ہیں۔

خانم جان اس ناول کا نسوانی مرکزی کردار ہے۔ وہ ایک پیشہ ور نائیکہ کی نواسی اور پیشہ ور کسبی کی بیٹی ہوتے ہوئے بھی ایک پاکباز اور باعصمت لڑکی ہے۔ مصنف اس کی شخصیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''صاحب جان نامی ایک عورت چنبل جان کی بیٹی شوہر اول سے تھی۔ چنبل جان اس کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ وہ نہایت حسین و جمیل بھی تھی۔ اس کو ایک پٹھان سردار نے نوکر رکھ لیا اور آخر کار بغیر ان کی رضامندی کے اس کے ساتھ نکاح کر لیا۔ ایک لڑکی اس سے پیدا ہوئی۔ چند روز بعد وہ سردار مر گیا اور صاحب جان اس کے اقربا کی وحشیانہ حرکتوں سے خائف ہو کے چنبل جان کے پاس بھاگ آئی۔ مگر چند ہی روز کے بعد وہ بھی مر گئی۔ اعظم جی نے اس کی لڑکی کو جس کا نام خانم جان ہے، اپنی فرزندی میں لے لیا ہے۔''[۷]

حسن شاہ کے کردار کے برعکس خانم جان کا کردار مثالی اور داستانوی تاثر کا حامل ہے۔ وہ انتہائی حسین و جمیل ہونے کے ساتھ ساتھ خوش گلو اور خوش ذوق ہے۔ حاضر دماغی اور حاضر جوابی کی صفات سے متصف ہے۔ حسن شاہ کی طرح جذباتی اور اس کا وجود ظاہر و باطنی ہر دو حوالوں سے عشق میں ڈھلا دکھائی دیتا ہے۔ تیز طبعی، ذکاوت، ذہانت، نزاکت اور نفاست میں یکتا و بے مثال ہے۔ وہ ایسی شخصیت کی مالک ہے کہ اس پر اُٹھنے والی ہر نگاہ مخمور و سرشار ہو جاتی ہے۔ وہ عمومی طور پر اداس اور بے کیف دکھائی دیتی ہے تاہم حسن شاہ اس کی خزاں زدہ زندگی میں بہار بن کر آیا تو اس کی شوخ مزاجی اور غمزہ و ادا کی خصوصیات کو بھی اظہار کا موقع ملا۔ وہ اپنی ہم جولیوں، گلبدن اور بی جان کے ساتھ مل کر حسن شاہ سے دل لگی اور چھیڑ چھاڑ بھی کرتی ہے۔

حسن شاہ میں جہاں اظہار تمنا میں ہچکچاہٹ دکھائی دیتی ہے وہاں خانم جان آگے بڑھ کر جرات رندانہ کا مظاہرہ کرتی ہے۔ خوف زدہ حسن شاہ کی مشکل آسان کرتے ہوئے محبت کے اظہار میں پہل کرنا اس کے حوصلے کو سامنے لاتا ہے۔ خانم جان کے محبت نامے جہاں اس کے سخن فہم و سخن شناس ہونے کی دلیل ہیں وہیں اس کی اعلیٰ درجے کی انشا پردازی کو بھی اُجاگر کرتے ہیں۔ حسن شاہ سراپا جذباتیت ہے تو خانم جان میں ٹھہراؤ، ضبط اور معاشرتی و سماجی شعور زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ راہ محبت کی سختیوں اور آزمائشوں کے بیان سے حسن شاہ کو آگاہ کرتے ہوئے لوٹ جانے کا مشورہ دیتی ہے۔ اگرچہ وہ بھی حسن شاہ کی طرح نوعمر ہے تاہم زندگی کی حقیقتوں کے بارے اس کے

تصورات زیادہ ٹھوس اور مستحکم ہیں۔اس کا خاندان اور پیشہ زندگی کی تلخیوں اور حقیقتوں سے آشنا کرنے کا بنیادی حوالہ ہے۔وہ ایک خط میں حسن شاہ کو خبردار کرتے ہوئے لکھتی ہے:

''کم بخت عشق کی ابتدا بہت ہی خوش آیند اور دل فریب ہوتی ہے مگر اس دشتِ لق ودق، وحشت انگیز میں جب پھنس جاتے ہیں، بڑے بڑوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ پتے پانی ہو جاتی ہیں۔دن کو ستارے نظر آتے ہیں۔دانتوں پسینا آجاتا ہے۔۔۔اس لیے میں سمجھاتی ہوں۔ابھی کچھ نہیں گیا ہے۔اس سے کنارہ کیجئے اور آسائش وآرام موجودہ کو غنیمت سمجھیے۔آپ بھی اس مہلکہ میں نہ پڑیے اور دوسرے کو بھی اپنے ساتھ نہ لے ڈوبیے۔''[۸]

خانم جان کی رگوں میں ایک پیشہ ور کسبی کا خون دوڑتا ہے تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ ایک پٹھان سردار کی بیٹی ہے اور اس کی شخصیت پر یہی حوالہ غالب نظر آتا ہے۔وہ طائفے کا فعال رکن ہوتے ہوئے بھی ایک گھریلو خاتون ہے۔اسے ایک شخص کی محبت میں گھر بسا کر زندگی گزارنا اچھا لگتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ طوائفوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی وہ اپنی عصمت اور آبرو کی حفاظت کرتی ہے۔اگرچہ اس کی ذات کا یہ پہلو قدرے غیر حقیقی دکھائی دیتا ہے تاہم یہ کوئی انہونی بات نہیں۔

خانم جان حسن شاہ کے عشق میں ڈھل کر سراپا عشق بن چکی ہے۔اب حسن شاہ محض لفظی نہیں بلکہ عملی طور پر اس کی زندگی ہے۔عشق کا یہ گہرا تاثر بھی کچھ عجیب یا نیا نہیں بلکہ عین فطرت انسانی ہے۔حسن شاہ کے دیدار اور میل ملاقات ہی اس کے جینے کا واحد ذریعہ اور سبب ہے یہی وجہ ہے کہ چند دن کی جدائی اسے اس قدر بیمار کر دیتی ہے کہ وہ موت کے منہ میں جانے سے نہیں بچ پاتی۔یوں اس کی موت اس کے کردار کو المیہ کے تاثر سے مملو کر دیتی ہے۔عشق میں خلوص وصداقت کی مثال بن کر ابدیت سے دوچار ہو جاتی ہے۔ڈاکٹر یوسف سرمست خانم جان کے کردار پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''یہ کردار اتنا خوبصورت اور جاندار ہے کہ ایک بار پڑھ لینے کے بعد انمٹ نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ خانم جان پندرہ سولہ سال کی ایک لڑکی ہے لیکن وہ بلا کی ذہین، بے حد حساس، حد درجہ شوخ، انتہائی حاضر جواب، بڑی ہی شریر، بہت ہی سنجیدہ، بے انتہا الھڑ، بہت زیادہ فہیم، بڑی ہی وضعدار، بہت جذباتی اور بہت ہی دور اندیش ہے۔''[۹]

منشی سجاد حسین (۱۸۵۶ء۔۱۹۱۰ء):

منشی سجاد حسین اُردو کے باکمال اور بڑے مزاح نگار ہیں۔۲۱ برس کی عمر میں اودھ پنچ اخبار کے اجراء کے ساتھ مزاح نگاری کی باقاعدہ تحریک کا آغاز کیا۔ان کے معروف ناول حاجی بغلول اور احمق الذین اسی اخبار کے

ذریعے سامنے آئے۔ اگر انہیں اُردو کا پہلا باقاعدہ مزاحیہ ناول نگار کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ حاجی بغلول ایک کرداری ناول ہے جو لکھنوی امراؤ کے مختار کار حاجی محمد بلغ العلی صاحب قبلہ مکی مدنی ثم لکھنوی کے مزاحیہ افکار و اعمال کی دلچسپ و دلشاد داستان ہے۔ حاجی بغلول کی سیرت کشی اور کردار نگاری میں منشی سجاد حسین کی طبع ظریف اپنی جملہ حشر سامانیوں سمیت عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ محمد بلغ العلی کے ملقب بہ حاجی ہونے کے پس منظر کو جس فنی چابک دستی سے اُردو کے مزاحیہ ناول میں سے بیان کیا ہے اس کی مثالیں بہت کم ملیں گی۔

> ''حاجی صاحب نے سفر حج کی زحمت تو خدانخواستہ کبھی خواب میں بھی نہ اٹھائی تھی ہاں طامس کوک کی بدولت ہزار ہا بندگان خدا کو اللہ کے گھر کا چالان ضرور دلوا دیا تھا۔ یہی حق کمیشن آپ کے نزدیک گھر بیٹھے کم سے کم ایک حج تو مہیا کر دینے کو کافی تھا۔ پس اگرچہ ہمارے حضرت خدا کی عنایت سے صرف بمبئی تک کے حاجی تھے مگر یہ سفر ایسا مقبول ہوا تھا کہ واپسی کے بعد ہی سے خلقت نے بے سوچے سمجھے، محض چند زمزمیوں، سرمے کی کنکریوں، خرموں، سفر دریا کی تکالیف، ناخداؤں کی مہربانی، دریائے شور کی کہانی، جہازیوں کی چند اصطلاحوں اور بدوؤں کی چند بدسلوکیوں کے قصے سن کر سبز عمامے، نیلی پوشاک اور ڈاڑھی، عین مہملہ اور حائے حطی کے صحیح مخرج سے ادا کرنے کی دستاویز پر بمصداق ظن المومنین خیرا، معتبر مستند باضابطہ سرٹیفکیٹ یافتہ حاجی اور وہ حاجی جس کو حج اکبر نصیب ہو چکا ہو، مان رکھا تھا۔''[۱۰]

حاجی بغلول کے کردار کو اگر خوجی کے کردار کا مثنیٰ کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ دونوں کرداروں میں مختلف النوع مماثلت ہے۔ بنیادی طور پر حاجی بغلول ایک ہونق، احمق اور بے وقوف شخص کی المیہ داستان ہے۔ وہ عقل، فہم، شعور اور فراست سے محروم شخص ہے۔ انا پرستی اور احساس برتری کے فریب کا شکار یہ کردار اپنی نوع بہ نوع حماقتوں سے سرمایہ تمسخر اور سامانِ تفننِ طبع بنتا ہے۔ جہاں یہ خود فریبی کا شکار ہے وہاں خود ناشناسی کے المیے نے اس کی زندگی کو دوسروں کی نگاہ میں تماشا بنا دیا۔ حاجی بغلول بھی خوجی کی طرح خود کو ذہین و فطین تصور کرتا ہے۔ وہ اپنے بے جا اور بلاوجہ زعم کے ہاتھوں روزانہ نت نئی مصیبتوں کا شکار ہو کر دکھ اُٹھاتا ہے۔ گھوڑے کی خریداری ہو یا محبت کے معاملات یا پھر کسی مہم کو سر کرنے کا جنون، بے چارہ حاجی بغلول ہر حوالے سے رسوائی و ناکامی کا منہ دیکھتا ہے۔

ہمارے کان جیسے ہی حاجی بغلول کا نام نامی سنتے ہیں، ذہن کے پردے پر اس کی حماقتوں اور بے وقوفیوں کی فلم رواں ہو جاتی ہے۔ اس کی مضحکہ خیز اور غیر متوازن سرگرمیاں ہمارے ہونٹوں پر بے اختیار ہنسی کا باعث بنتی ہیں۔ حاجی بغلول کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے مبالغہ آمیزی کا احساس اسے ایک مثالی مضحک کردار کے سانچے میں ڈھالتا نظر آتا ہے۔ حاجی صاحب کی صورت ہو یا سیرت، انداز تکلم ہو یا افعال و اعمال، اس کی شخصیت کا ہر زاویہ سامان تفنن طبع ہے۔ ایسا نہیں کہ حاجی صاحب لوگوں کو ہنسانے کی شعوری کوشش کرتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ

بظاہر سنجیدگی ومتانت اور بزعم خود بڑی فراست سے ایسی حرکتیں کرتا ہے جو ہنسی کا باعث بنتی ہیں۔اس کے کردار کا یہ پہلو اسے مزاحیہ کردار بناتا ہے۔گویا حاجی بغلول ایک مسخرہ نہیں بلکہ مضحک کردار ہے۔

احمق الذین:

منشی سجاد حسین کا دوسرا ناول ''احمق الذین'' بھی کرداری ناول ہے جو حاجی بغلول کی طرح ہی ہونق، حواس باختہ اور خام کار ''بھولے نواب'' کی شخصیت کے ارتقائی پہلوؤں کا مضحک اظہاریہ ہے۔موصوف پولیس سے بلاوجہ خوف زدہ ہوکر لکھنو سے دکن جا کر روپوش ہوئے اور جگہ جگہ ٹھگوں اور نوسر بازوں سے لٹتے لٹاتے کسی نواب کی ملازمت میں جدید مغربی طرز زندگی اختیار کرنے کے بعد رفارمر بن گئے۔مباحثوں اور مناظروں کے بعد سودائی ہو کر پاگل خانے کی نذر ہو گئے۔منشی سجاد حسین چونکہ قدامت پسند اور مغربی معاشرت اور انداز فکر وعمل کے سخت خلاف تھے لہٰذا ان کی عمر سرسید احمد خان اور تحریک علی گڑھ کی ہجو کرتے اور تمسخر اڑاتے گزری۔بھولے نواب جیسے ہونق کو جدیدیت اور مغربی تہذیب وتمدن کا دلدادہ اور پیروکار دکھا کر ان ہندوستانیوں کو ہدف تنقید وطعن بنایا گیا جو ہندوستانی اور بطور خاص لکھنوی معاشرت کے شاکی اور باغی تھے۔پھر بھولے نواب کو ریفارمر اور بالآخر پاگل دکھا کر منشی سجاد حسین نے گویا سرسید اور ان کے پیروکاروں کے خلاف خوب زہر اگلا۔

بدحواس اور منتشر شخصیت کا مالک بھولے نواب باپ کے مرنے کے بعد ترکے میں ملی دولت سے خوب گلچھرے اڑاتے ہیں۔اس کی شخصیت کا یہ پہلو زوال یافتہ لکھنو کے انحطاط پذیر تمدن اور معاشرت کا روایتی نوابی پہلو ہے۔اس زاویے سے وہ ایک لاابالی، عیاش اور مجہول ومنفعل کردار نظر آتا ہے۔تاہم دکن میں اس کی روپوشی کا زمانہ اس کی شخصیت میں فکر وعمل کی ٹھوس تبدیلی کا باعث بنا۔دکن میں درپیش حالات اس کے کردار میں شعور اور استحکام کی صفات پیدا کرتے ہیں۔بطور رفارمر اس کے مناظرے اس کی فہم وفراست، شعور اور علم کا ثبوت ہیں۔مختلف سرکاروں میں اس کی ملازمتیں کی شخصی پختگی کی علامت ہیں۔منشی سجاد حسین نے آئین نو سے ڈرتے اور طرز کہن پر اڑتے ہوئے بھلے ہی اس کی جدید اور مغربی بود وباش کو اپنے طنز، غصے، حسد اور جلاپے کا نشانہ بنایا ہے تاہم وہ بھولے نواب کی عقلیت پسندی اور منطقی واستدلالی طرز فکر وعمل کو اسی جدیدیت کا ثمر قرار دیتے دکھائی دیتے ہیں۔

حواشی:

۱۔ یوسف سرمست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اُردو ناول، (نئی دہلی: ترقی اُردو بیورو، ۱۹۹۵ء)، ص: ۶۷
۲۔ سجاد حسین انجم کسمنڈوی (مترجم)، نشتر، (لاہور: مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۶۳ء)، ص: ۱۶
۳۔ ایضاً، ص: ۲۲
۴۔ ایضاً، ص: ۳۳
۵۔ ایضاً، ص: ۳۶
۶۔ ایضاً، ص: ۴۷
۷۔ ایضاً، ص: ۲۵
۸۔ ایضاً، ص: ۸۵۔۸۶
۹۔ یوسف سرمست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اُردو ناول، ص: ۶۸
۱۰۔ منشی سجاد حسین، حاجی بغلول مشمولہ نقوش (طنز و مزاح نمبر)، مرتبہ: محمد طفیل، لاہور، شمارہ ۷۱۔۷۲، فروری ۱۹۵۹ء، ص: ۸۶۱

مآخذ:

۱۔ سجاد حسین انجم کسمنڈوی (مترجم)، نشتر، لاہور: مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۶۳ء۔
۲۔ یوسف سرمست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اُردو ناول، نئی دہلی: ترقی اُردو بیورو، ۱۹۹۵ء۔